وحید الدین خاں

خدا کا وجود اور اُس سے ہمارا تعلق

اس کائنات کا ایک خدا ہے جو اس کا خالق اور مالک ہے۔ خدا نے ایک خاص سکیم کے تحت ہم کو پیدا کیا ہے، جس کا علم وہ اپنے مخصوص اور منتخب بندوں کے ذریعہ ہم تک بھیجتا ہے، جن کو ہم رسول کہتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس سلسلے کے آخری رسول ہیں اور اب تمام دنیا کو آپؐ کی پیروی کرنی ہے۔ جو شخص آپ کی دعوت کو پائے اور پھر اسکو قبول نہ کرے وہ صرف آپ ہی کا انکار نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت خدا کے تمام نبیوں کا انکار کر دیتا ہے، ایسا شخص خدا کا وفادار نہیں بلکہ اس کا باغی ہے اور خدا کی رحمتوں میں اس کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ ہے مختصر طور پر اسلام کا تعارف، جس کی مجھے اس مضمون میں تشریح کرنی ہے۔

خدا کا وجود سب سے پہلے اس سوال کو لیجئے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، بعض لوگ اس بات کو نہیں مانتے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سارا کارخانہ محض ایک اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگیا ہے، اور اپنے آپ چلا جا رہا ہے۔

ہکسلے کے الفاظ ہیں: چھ بندر ایک ایک ٹائپ رائٹر لے کر بیٹھ جائیں اور اربوں اور کھربوں سال تک الل ٹپ طریقے سے ان کو پیٹتے رہیں تو ہو سکتا ہے کہ ان کے سیاہ کئے ہوئے کاغذات کے ڈھیر میں کسی صفحے پر شکسپیر کی ایک نظم نکل آئے۔ اسی طرح اربوں اور کھربوں سال تک مادے کے اندھے عمل کے دوران میں بالکل اتفاق سے یہ دنیا بن گئی ہے۔

یہ جواب جس نے صدیوں سے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ یہ

دراصل کوئی جواب نہیں ہے۔ بلکہ محض چند الفاظ کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ اتفاق یا حادثہ بذات خود کوئی چیز نہیں ہے۔ پھر جو چیز خود ہی اپنا وجود نہ رکھتی ہو وہ کسی دوسری چیز کو وجود میں لانے کا سبب کس طرح بن سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی یہ تشریح کائنات کے اوپر بالکل چسپاں نہیں ہوتی، یہ محض ایک بنیادی دعویٰ ہے۔ جو ذہنوں میں گھڑ لیا گیا ہے۔ اور کائنات کی حقیقی ساخت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس خدا کا تصور کائنات کے ساتھ بالکل ہم آہنگ ہو جاتا ہے، وہ خود کائنات کے اندر سے بول رہا ہے۔

کائنات اتنی پر حکمت، اور اتنی منظم ہے کہ اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کسی اتفاقی حادثے کے طور پر وجود میں آگئی ہو۔ زمین پر جاندار چیزوں کی بقا کے لئے جو حالات ضروری ہیں، وہ نہایت مکمل طور پر یہاں موجود ہیں۔ کیا محض اتفاق کے نتیجے میں اتنے عمدہ حالات پیدا ہو سکتے ہیں۔

زمین اپنے محور پر ایک ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے لٹو کی مانند گھومتی ہے۔ اگر زمین کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ ہوتی تو ہمارے دن اور رات اب کے دن اور رات سے دس گنا زیادہ لمبے ہوتے۔ زمین کی تمام ہریالی اور ہماری بہترین فصلیں سو گھنٹے کی مسلسل دھوپ میں جھلس جاتیں اور جو بچ رہتیں وہ لمبی رات میں سردی کی نذر ہو جاتیں۔

سورج جو ہماری زندگی کا سرچشمہ ہے، اپنی سطح پر بارہ ہزار ڈگری فارن ہیٹ سے دہک رہا ہے۔ یہ حرارت اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے پہاڑ بھی اس کے سامنے جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ مگر وہ ہماری زمین سے اتنے مناسب فاصلے پر ہے کہ یہ "دائمی انگیٹھی" ہمیں ہماری ضرورت سے ذرہ بھر زیادہ گرمی نہ دے سکے۔ اگر سورج دگنے فاصلہ پر چلا جاتے تو زمین پر اتنی سردی پیدا ہو گی کہ ہم سب لوگ جم کر برف ہو جائیں گے اور اگر وہ آدھے فاصلے پر آجائے تو زمین پر اتنی حرارت پیدا ہو گی کہ تمام جاندار اور تمام پودے جل بھن کر خاک ہو جائیں گے۔

زمین کا کرہ فضا میں سیدھا کھڑا نہیں ہے، بلکہ ۲۳ درجہ کا زاویہ بناتا ہوا ایک طرف کو جھکا ہوا ہے۔ یہ جھکاؤ نہ ہوتا تو سمندر سے اٹھتے ہوئے بخارات سیدھے شمال یا جنوب کو چلے جاتے۔ اور ہمارے براعظم برف سے ڈھکے رہتے۔

چاند ہم سے تقریباً ڈھائی لاکھ میل کے فاصلے پر ہے۔ اس کی بجائے اگر وہ صرف ایک لاکھ میل دور ہوتا تو سمندروں میں مدوجزر کی لہریں اتنی بلند ہوتیں کہ تمام کرۂ ارض دن میں دو بار پانی میں ڈوب جاتا اور بڑے بڑے پہاڑ موجوں کے ٹکرانے سے گھس کر ختم ہو جاتے۔

یہ ہماری کائنات کے چند نہایت معمولی اور بالکل سادہ واقعات ہیں۔ ان کے سوا بیشمار ایسے واقعات ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری زمین پر ان کا اجتماع محض اتفاقی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اور نہ محض اتفاق انہیں باقی رکھ سکتا ہے۔ یقیناً کوئی ہے جو ان واقعات کو وجود میں لایا ہے، اور ان کو اس قدر منظم طریقہ پر مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے۔ کائنات اتنی مربوط اور منظم ہے کہ جب بھی ہم اس کے کسی واقعہ کو بیان کرتے ہیں تو در حقیقت ہم اس کو محدود کر دیتے ہیں، کائنات کے ایک ایک جزو کے اندر اتنی حکمتیں ہیں کہ جب بھی ہم اس کی کسی حکمت کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ہم اسکو ایک کمتر درجے کی چیز بنا کر پیش کر رہے ہیں، ایسی ایک کائنات کو خدا کی مخلوق ماننا اگر کسی کو خلاف عقل معلوم ہوتا ہے تو اس سے زیادہ خلاف عقل بات یہ ہے کہ اس کائنات کو بے خدا فرض کر لیا جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے سب چیزیں پیدا کی ہیں تو خود خدا کو کس نے پیدا کیا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہر حال میں پیدا ہوتا ہے، خواہ ہم خدا کو مانیں یا نہ مانیں۔ ہم دو میں سے کسی ایک چیز کو بلا سبب ماننے پر مجبور ہیں۔ یا خدا کو بے سبب مانیں، یا کائنات کو۔ ہمارے سامنے ایک عظیم کائنات ہے جس کو ہم دیکھتے ہیں، جس کو ہم محسوس کرتے ہیں۔ مجبور ہیں کہ اس کائنات کے وجود کو تسلیم کریں۔ ہم اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یا تو یہ کہیں کہ کائنات خود سے وجود میں آگئی ہے یا یہ کہیں کہ کوئی اور ہستی ہے جس نے اس کو بنایا ہے، دونوں صورتوں میں ہم کسی نہ کسی کو بلا سبب تسلیم کریں گے۔ پھر کیوں نہ ہم خدا کو بلا سبب مان لیں جس کو ماننے کی صورت میں ہمارے تمام سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ جب کہ کائنات کو بلا سبب ماننے کی شکل میں کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ وہ تمام سوالات جو اس مسئلے کے اردگرد پیدا ہوتے ہیں وہ سب کے سب بدستور باقی رہتے ہیں ــــ

بعض لوگوں نے فلسفیانہ موشگافی کے ذریعہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کائنات کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ سب کچھ صرف ہمارا وہم ہے، مگر ایک شخص جب یہ بات کہتا ہے تو ٹھیک اسی وقت وہ کائنات کے وجود کو تسلیم کر لیتا ہے۔ آخر یہ سوال ہی کیوں پیدا ہوا کہ کائنات کوئی چیز ہے یا نہیں۔ سوال کا پیدا ہونا خود ظاہر کرتا ہے کہ کوئی چیز ہے جس کے بارے میں سوال درپیش ہے، اور کوئی ہے جس کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے۔ اس طرح فلسفۂ تشکیک بیک وقت انسان اور کائنات دونوں کو تسلیم کر لیتا ہے۔

خدا کے ساتھ ہمارا تعلق | خدا کو ماننے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ ہمارا تعلق کیا ہے۔ پچاس سال پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر خدا کا کوئی وجود ہے بھی تو اس سے ہمارا تعلق نہیں ہو سکتا، مگر جدید کوانٹم نظریہ کے ذریعہ خود سائنس نے اسکی تردید کر دی ہے پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ کائنات ایک مشین ہے جو ایک مرتبہ حرکت دینے کے بعد مسلسل چلی جا رہی ہے اس نظریے پر سائنس والوں کو اس قدر یقین تھا کہ انیسویں صدی کے آخر میں برلن کے پروفیسر ماکس پلانک نے جب روشنی کے متعلق بعض ایسی تشریحات پیش کیں جو کائنات کے مشین ہونے کو غلط ثابت کر رہی تھیں تو اس پر سخت تنقیدیں ہونے لگیں، اور اس کا مذاق اڑایا گیا، مگر اس نظریئے کو زبردست کامیابی ہوئی اور بالآخر وہ ترقی کر کے جدید کوانٹم نظریہ کی صورت میں آج علم طبیعیات کے اہم اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے[۱]

پلانک کا نظریہ اپنی ابتدائی شکل میں یہ تھا کہ قدرت چھلانگوں کے ذریعہ حرکت کرتی ہے۔ ۱۹۱۷ء میں آئن سٹائن نے اس بات کی وضاحت کی کہ پلانک کا نظریہ صرف عدم تسلسل ثابت نہیں کرتا بلکہ زیادہ انقلاب انگیز نتائج کا حامل ہے۔ یہ اصولِ تعلیل کو اس کے بلند مقام سے معزول کر رہا ہے۔ جو اس سے پہلے عالم فطرت کے تمام واقعات کا رہنما سمجھا جاتا تھا۔ قدیم سائنس نے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ قدرت صرف ایک ہی راستہ اختیار کر سکتی ہے جو سبب اور نتیجے کی مسلسل کڑیوں کے مطابق اس کے آغاز سے لے کر انجام تک معین ہو چکا ہے۔ مگر اب معلوم ہوا کہ یہ محض ناقص مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ پہلے یہ کہا جاتا تھا کہ خدا کو اگر ماننا ہی ہے تو سبب اوّل کے طور پر اسے مان لو ورنہ آج کائنات کو خدا کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا کہ کائنات صرف حرکتِ اوّل کے لئے کسی محرک کی محتاج نہیں تھی، بلکہ وہ ہر آن حرکت دیئے جانے کی محتاج ہے۔ کوانٹم نظریہ دوسرے لفظوں میں یہ بتاتا ہے کہ کائنات ایک خود چالو مشین نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی مشین ہے جس کو ہر آن چلایا جا رہا ہے۔ ایک حی و قیوم ہستی کا مسلسل فیضان ہے جو اس کو باقی رکھے ہوئے ہے اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ اپنا فیضان واپس لے لے تو ساری کائنات اس طرح ختم ہو جائے گی، جیسے سینما گھر میں بجلی کا سلسلہ ٹوٹنے سے پردۂ سیمیں کے سارے واقعات غائب ہو جاتے ہیں۔ اور ناظرین کے سامنے ایک سفید کپڑے کے سوا اور

---

[۱] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو۔ ماڈرن سائنٹفک تھاٹ، صفحات ۱۲ - ۲۰

کچھ نہیں رہتا۔ گویا اس دنیا کا ہر ذرّہ اپنے وجود اور حرکت کے لئے ہر آن قادرِ مطلق سے اجازت طلب کرتا ہے۔ اس کے بغیر وہ اپنی ہستی کو قائم نہیں رکھ سکتا۔

کائنات کے ساتھ خدا کا یہ تعلق خود بتاتا ہے کہ انسان کے ساتھ اس کا تعلق کیا ہونا چاہئے ظاہر ہے کہ جس نے ہمیں خلق کیا ہے، جو ہمارے لئے تمام موزوں ترین حالات کو مسلسل باقی رکھے ہوئے ہے اور ان کو ہمارے حق میں ہموار کرتا رہتا ہے جو ہر آن ہماری پرورش کر رہا ہے۔ اس کا ہمارے اوپر یہ لازمی حق ہے کہ ہم اپنے مقابلے میں اسکی برتر حیثیت کو تسلیم کریں۔ اور بالکل اس کے بندے بن جائیں۔ انسان جن قدروں سے واقف ہے، ان میں سب سے نمایاں اور اہم ترین قدر یہ ہے کہ احسان کرنے والے کا احسان مانا جائے محسن خواہ اپنی طرف سے نہ دبائے مگر جو احسان مند ہے وہ خود اس کے سامنے دب جاتا ہے۔ محسن کے آگے اس کو نظر اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ خدا کا خدا ہونا خود ہی اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کی خدائی کو تسلیم کریں اور اسکی مرضی پوری کرنے کو اپنی زندگی کا مقصد بنائیں۔ بندے کی طرف سے خدا کی اطاعت کے لئے اس کے سوا کسی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ یہ صرف حق شناسی کا تقاضا نہیں ہے کہ ہم خدا کی خدائی اور اس کے مقابلے میں اپنی بندگی کو تسلیم کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس کے سوا کوئی راہ بھی نہیں ہے۔ ہماری زندگی کے سارے مسائل خدا سے متعلق ہیں۔ ہم کو جو کچھ ملے گا، اسی سے ملے گا، اس کے سوا کوئی اور ہمیں کچھ نہیں دے سکتا۔ ہم اس کائنات میں اس قدر عاجز اور مجبور ہیں کہ خدا کی مدد کے بغیر ایک لمحہ کے لئے اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتے۔ پھر خدا کو چھوڑ کر آخر ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔

ذرا غور کیجئے یہ ہندوستان کی شمالی سرحد پر ہمالیہ پہاڑ کا ڈھائی ہزار میل لمبا سلسلہ کس نے قائم کیا ہے۔ ہم نے یا خدا نے ۔؟ اگر ہمالیہ پہاڑ نہ ہوتا تو خلیج بنگال سے اٹھنے والی جنوب مشرقی ہوائیں جو ہر سال ہمارے لئے بارش لاتی ہیں۔ بالکل پانی نہ برسائیں اور سیدھی روس کی طرف نکل جائیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ تمام شمالی ہندوستان منگولیا کی طرح ریگستان ہوتا۔

آپ کو معلوم ہے کہ سورج اپنی غیر معمولی کشش سے ہماری زمین کو کھینچ رہا ہے، اور زمین ایک مرکز گریز قوت کے ذریعہ اس کی طرف کھنچ جانے سے اپنے آپ کو روکتی ہے اور اسطرح وہ سورج سے دور رہ کر فضا کے اندر اپنا وجود باقی رکھے ہوئے ہے۔ اگر کسی دن زمین کی یہ

قوت ختم ہو جائے تو وہ تقریباً چھ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سورج کی طرف کھنچنا شروع ہو جائے گی، اور چند ہفتوں میں سورج کے اندر اس طرح جا گرے گی جیسے کسی بہت بڑے الاؤ کے اندر کوئی تنکا گر جائے۔ ظاہر ہے کہ زمین کو یہ طاقت ہم نے نہیں دی ہے بلکہ اس خدا نے دی ہے جس نے زمین کو پیدا کیا ہے۔

کائنات کے جس حصے میں ہم رہتے ہیں اس کا نام نظام شمسی ہے، اگر آپ کسی دور دراز مقام پر بیٹھ کر اس نظام کا مشاہدہ کر سکیں تو آپ دیکھیں گے کہ اتھاہ خلا کے اندر ایک آگ کا گولا بھڑک رہا ہے جو ہماری زمین سے تیرہ لاکھ گنا بڑا ہے جس سے اتنے بڑے بڑے شعلے نکلتے ہیں جو کئی کئی لاکھ میل تک فضا میں اڑتے چلے جاتے ہیں، اسی کا نام سورج ہے۔ پھر آپ ان سیاروں کو دیکھیں گے جو سورج کے چاروں طرف اربوں میل کے دائرے میں پروانوں کی طرح چکر لگا رہے ہیں۔ ان دوڑتی ہوئی دنیاؤں میں ہماری زمین نسبتاً ایک چھوٹی دنیا ہے جس کی گولائی تقریباً پچیس ہزار میل ہے۔ یہ ہمارا نظام شمسی ہے جو بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے، مگر کائنات کی وسعت کے مقابلے میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ کائنات میں اتنے بڑے بڑے ستارے ہیں جن کے اوپر ہمارا پورا نظام شمسی رکھا جا سکتا ہے۔ اس بے انتہا وسیع اور عظیم کائنات میں ہماری زمین فضا میں اڑنے والے ایک ذرے سے بھی زیادہ حقیر ہے۔ ہم ایک چھوٹے سے کیڑے کی مانند اس ذرے سے چمٹے ہوئے ہیں اور خلا میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سفر میں مصروف ہیں۔

یہ کائنات کے اندر ہماری حیثیت ہے، غور کیجئے انسان کس درجہ حقیر ہے اور خارجی طاقتوں کے مقابلے میں کس قدر عاجز ہے۔ پھر جب ہماری حیثیت یہ ہے تو ہم خالق کائنات سے مدد طلب کرنے کے سوا اور کیا کر سکتے ہیں۔ جس طرح ایک چھوٹے بچے کی ساری کائنات اس کے ماں باپ ہوتے ہیں، اسکی زندگی، اسکی ضرورتوں کی تکمیل اور اس کے مستقبل کا انحصار بالکل اس کے والدین کے اوپر ہوتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ انسان اپنے رب کا محتاج ہے۔ ہم خدا کی مدد اور اس کی رہنمائی کے بغیر اپنے لئے کسی چیز کا تصور نہیں کر سکتے وہی ہمارا سہارا ہے اور اسی کی طرف ہمیں دوڑنا چاہیئے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ انسان خدا کی رہنمائی اور اس کی مدد کا محتاج ہے خدا کی طرف سے انسان کی یہی حیثیت قرار پاتی ہے۔ اور خود انسان کے لیئے بھی اس کے سوا

چارہ نہیں ہے کہ وہ خدا سے اپنے لیئے مدد اور رہنمائی کی درخواست کرے۔

معرفت کا حصول | یہاں پہنچ کر جب ہم اپنے گرد و پیش کی دنیا پر غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کے خالق کی طرف سے اپنی مخلوقات کے لئے مدد اور رہنمائی کا ایک مستقل عمل جاری ہے جس کو جس چیز کی ضرورت ہے اس کو وہ چیز پہنچائی جا رہی ہے ایک معمولی بھڑ کی مثال لیجئے۔

بھڑ کا طریقہ ہے کہ وہ انڈے دینے سے پہلے زمین میں ایک گڑھا کھودتی ہے، اور ایک ٹڈے کو قابو میں کر کے اس کو گڑھے میں رکھ دیتی ہے۔ ایسا کرتے وقت وہ نہایت صحت کے ساتھ ٹڈے کے اس خاص عصبی مقام پر ڈنگ مارتی ہے جس سے ٹڈا مرتا نہیں صرف بے ہوش رہتا ہے اور تازہ گوشت کا ذخیرہ بن جاتا ہے[1] پھر اب اس بیہوش ٹڈے کے اردگرد انڈے دیتی ہے تاکہ انڈوں سے نکل کر بچے اس زندہ ٹڈے کو دھیرے دھیرے کھاتے رہیں۔ کیونکہ مردہ گوشت ان بچوں کے لیے مہلک ہے۔ اتنا انتظام کر لینے کے بعد بھڑ وہاں سے اڑ جاتی ہے اور پھر کبھی آکر اپنے بچوں کو نہیں دیکھتی۔ مگر اس کے باوجود بھڑ کا یہ بچہ جب بڑا ہوتا ہے تو وہ بھی ٹھیک اسی عمل کو دہراتا ہے۔ ساری بھڑیں اس کام کو زندگی میں ایک بار اور پہلی بار بالکل ٹھیک ٹھیک انجام دیتی ہیں، غور کیجئے کہ وہ کون ہے جو اس بھڑ کے بچے کو سکھاتا ہے کہ اپنی نسل کو جاری رکھنے کے لیئے وہ بھی آئندہ وہی عمل کرے جو اس کے ماں باپ نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ حالانکہ اپنے ماں باپ کے عمل کو اس نے کبھی نہیں دیکھا۔

دوسری مثال اس لمبی مچھلی کی ہے جسے انگریزی میں ایل کہتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب جاندار اپنی زندگی کی جوانی میں ہر جگہ کے آبی مرکزوں اور ندیوں سے نکل نکل کر جزیرہ مو‌ڈا کے پاس سمندر کے ایک گہرے تہہ میں جاتے ہیں۔ یورپ کی ایلیں اٹلانٹک میں تین ہزار میل کا راستہ طے کر کے یہاں پہنچتی ہیں۔ وہیں یہ سب مچھلیاں بچے دے کر مر جاتی ہیں۔ یہ بچے جب آنکھ کھولتے ہیں تو اپنے آپ کو ایک سنسان آبی مرکز میں پڑا ہوا پاتے ہیں۔ ان کے پاس بظاہر معلومات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا، پھر بھی وہ وہاں سے لوٹ کر دوبارہ انہیں کناروں پر آ لگتے ہیں جہاں سے ان کے والدین چلے گئے تھے۔ وہ آگے بڑھتے ہوئے اپنے

---

[1] اسی حیرت انگیز عمل کو دیکھ کر فلسفی برگساں نے کہا تھا۔ "کیا بھڑ نے کسی مدرسے میں ماہر عضویات کی تعلیم حاصل کی ہے"

ماں باپ والی ندیوں، جھیلوں اور آبی مرکزوں میں پہنچ جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کسی بھی آبی مرکز سے ایلیں ہمیشہ کے لئے غائب نہیں ہوجاتیں۔ اور یہ سب کچھ اسطرح ہوتا ہے کہ امریکہ کی کوئی ایل یورپ میں نہیں ملتی اور نہ یورپ کی کوئی ایل امریکہ کے سمندروں میں پائی جاتی ہے۔ آمد و رفت کی یہ معلومات انہیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

یہ کام وحی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ وحی، پیغام رسانی کے اس مخفی سلسلے کو کہتے ہیں جو خدا اور اس کی مخلوقات کے درمیان جاری ہے۔ کوئی مخلوق زندگی گذارنے کیلئے کیا کرے اور خالق کائنات نے اپنی مجموعی سکیم کے اندر اس کے ذمے جو فرض عائد کیا ہے اس کو کس طرح انجام دے، اسی کو بتانے کا نام وحی ہے۔

اس وحی کی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کا تعلق انسان کے سوا دوسری مخلوقات سے ہے، اور دوسری وہ جس کا تعلق انسان سے ہے ـــــ انسان کے سوا جتنی زندہ مخلوقات اس زمین پر پائی جاتی ہے۔ وہ سب کی سب ارادے سے خالی ہے۔ ان کا کام کسی سوچے سمجھے فیصلے اور ارادے کے تحت نہیں ہوتا بلکہ ایک غیر شعوری قسم کے طبعی میلان کے تحت ہوتا ہے جس کو ہم جبلت کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک طرح کی زندہ مشینیں ہیں جو محدود دائرے میں اپنا متعین عمل کرکے ختم ہوجاتی ہیں۔ اس قسم کے جانداروں کے لئے ترک و اختیار کا کوئی سوال نہیں۔ اس لئے ان کے پاس جو وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں نہیں آتی بلکہ جبلت یا عادت فطری کی شکل میں آتی ہے۔ ان کی ساخت اس طرز کی بنادی جاتی ہے کہ وہ ایک مخصوص کام کو باربار دہراتے رہیں۔ مگر انسان ایسی مخلوق ہے جو فیصلے کی قوت رکھتا ہے۔ وہ اپنے ارادے سے کسی کام کو کرتا ہے اور کسی کام کو نہیں کرتا۔ وہ ایک کام کرنا شروع کرتا ہے پھر اسے بالقصد چھوڑ دیتا ہے اور ایک کام نہیں کرتا اور بعد کو اسے کرنے لگتا ہے اس سے ظاہر ہوا کہ انسان بھی اگرچہ اسی طرح خدا کا بندہ ہے جسطرح اسکی دوسری مخلوقات، مگر اسکو حالت امتحان میں رکھا گیا ہے۔ جو کام دوسری مخلوقات سے عادت فطری کے تحت لیا جارہا ہے انسان کو وہی کام اپنے فیصلے اور ارادے سے کرنا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان کے پاس وحی آتی ہے وہ حکم اور قانون کی شکل میں آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں عالم حیوانات پر وحی انکی فطرت میں پیوست کردی گئی ہے۔ اور انسان کی وحی خارج سے اسے ، جاتی ہے۔ عام حیوانات کو کیا کرنا ہے اسکا علم وہ پیدائشی طور پر اپنے ساتھ لیکر آتے ہیں اس کے برعکس انسان جب عقل و ہوش کی عمر کو پہنچتا ہے تو خدا کیطرف سے پکار کر اسے بتایا جاتا ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہئے ـــــ اس پیغام رسانی کا ذریعہ رسالت ہے، جو شخص یہ پیغام لیکر آتا ہے اسکو ہم رسول کہتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے ایک نیک بندے کو چن لیتا ہے اور اسکے قلب پر اپنا پیغام اتارتا ہے اسطرح وہ شخص براہ راست خدا سے اسکی مرضی کا علم حاصل کرکے دوسرے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ رسول گویا وہ درمیانی کڑی ہے جو بندے کو اس کے خدا سے جوڑتی ہے۔